اپنے سائے کے سوا

(ایک سو ایک مختصر نظمیں)

ڈاکٹر اختر بستوی

یہ کتاب اترپردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی

شاعر و ناشر :- ڈاکٹر اختر بستوی
(لیکچرر، شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور)

اشاعت کا سنہ :- ۱۹۸۹ء

تعداد :- چھ سو

ایڈیشن :- پہلا

کتابت :- ڈاکٹر محمد شعیب گورکھپوری

طباعت :- آفسٹ پریس گورکھپور

قیمت :- پچھتر روپے (Rs 75/-)

—— تقسیم کار ——

آواز پبلیکیشنز۔ ریتی کاؤنس گورکھپور (یو۔پی)

اس کتاب کے مندرجات سے اترپردیش اردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں

اپنے
سائے
کے
سوا

ڈاکٹر اختر بستوی

پیش لفظ

از

کیفی اعظمی

میں حیران ہوں کہ ڈاکٹر اختر بستوی کی ہشت پہلو شخصیت کا مطالعہ کس رُخ سے شروع کروں۔ وہ ایک فصیح و بلیغ خطیب ہیں۔ وہ بہت شگفتہ اور شاداب نثر لکھتے ہیں۔ وہ بہت ہی کامیاب مترجم ہیں ("شہرِ دوز")۔ طویل نظمیں لکھنے میں انھیں استادانہ مہارت حاصل ہے ("نغمۂ شب" اور "بحرِ بیکراں")۔ اختر انصاری اور نریش کمار شاد کے بعد سب سے اچھے قطعات ڈاکٹر اختر بستوی نے لکھے ہیں ("پیکرِ خیال")۔ وہ تالیف و تدوین کا بھی ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں ("سخن جوہر")۔ ان کی تنقیدی اور تحقیقی نظر بھی معتبر ہے ("سخن جوہر" کے حواشی و مقدمہ)۔ ان کے

شاگردوں نے بتایا کہ وہ ایک شفیق استاد ہیں، لیکن اِس وقت میں
صرف ان کی شاعری کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ان کا شعری مجموعہ
"اپنے سائے کے سوا" اِس وقت میرے پیش نظر ہے۔ اس مجموعے
میں اختر صاحب نے اپنی ایک سو ایک مختصر نظمیں جمع کی ہیں۔ اِن
نظموں کے بارے میں میں جو کچھ سب سے پہلے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے
کہ یہ سب نظمیں نظم کے فن پر پوری اترتی ہیں۔ آج کل ہماری
زبان میں نظم کے نام سے جو چیزیں لکھی جا رہی ہیں وہ یا تو مختصر
مثنویاں ہوتی ہیں یا غزل مسلسل۔ وہ نظمیں نہیں ہوتی ہیں۔ اختر صاحب کی
یہ نظمیں خیال کی اکائیاں ہیں۔ آپ کو کسی بھی نظم میں نہ خیال
کی تکرار ملے گی نہ لفظوں اور ترکیبوں کی غیر ضروری کثرت۔ آپ
جس نظم کو غور سے پڑھیں آپ کو اندازہ ہوگا کہ شاعر کے ذہن میں
سب سے پہلے ایک خیال اُبھرا، پھر اس خیال کو کامیابی کے
ساتھ ادا کرنے کے لئے شاعر نے بحر اور امیجری کا انتخاب کیا، اور
جہاں شاعر نے محسوس کیا کہ بات پوری ہو گئی شاعر نے نظم وہیں
ختم کر دی۔ مثلاً اس مجموعے میں اختر صاحب کی ایک نظم ہے

"افعال کا حاصل"۔ یہ صرف آٹھ مصرعوں کی نظم ہے، لیکن اِس مختصر سی نظم کو آپ گیتا کی جو کرم کی فلاسفی ہے اُس کا نچوڑ کہہ سکتے ہیں ــــــ

انسان اپنے مشاہدے اور مطالعے کی بنا پر فکر و خیال کی کتنی دنیائیں اور کتنے عالم آباد کرتا ہے۔ غالب نے دیدۂ بینا اس کو کہا ہے جس کو قطرے میں دجلہ دکھائی دے یا جو پتھر کے سینے میں بتانِ آذری کا رقص دیکھتا ہو لیکن یہ دیدۂ بینا کتنوں کو حاصل ہوتا ہے؟ عام طور سے مشاہدہ کتنا سطحی اور حقیقت سے کتنا ناآشنا ہوتا ہے یہ آپ اختر صاحب سے سنیئے:

مشاہدہ

دیوار میں روزن تو ہُوا کرتے ہیں لیکن
دل میں نہیں ہوتا کوئی اِس دور میں روزن
پڑتی ہے نظر سب کی تماشوں پہ جہاں کے
رہتا ہے نگاہوں سے چھپا سینے کا درپن
دیتی ہے ہر اک چیز زمانے کی دِکھائی
ہوتا نہیں خود اپنا ہی دیدار میسّر

باہر کے مناظر ہیں ہیں الجھی ہوئی نظریں
آنکھوں سے ہیں اوجھل وہ نظارے جو ہیں اندر

شاعر اس ظاہر بینی ، اور دروں بینی کی کمی کو شاید اس لئے بھی اپنا ہدف بنا رہا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات بھی ہو گی کہ جو اپنے کو نہیں پہچان سکتا وہ اپنے رب کو بھی نہیں پہچان سکتا۔

اختر صاحب کے ذہن میں اگر کوئی پرانا خیال بھی ابھرتا ہے تو ان کے اسلوب اور لہجے کی تازہ کاری اس میں ایسی تازگی اور ندرت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ خیال انھیں کا ہو جاتا ہے۔ غالب کا ایک لافانی شعر ہے ؎

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اختر صاحب یہ بات آٹھ مصرعوں میں اِس طرح کہتے ہیں کہ غالب کے شعر کی طرف قاری کا دھیان بھی نہ جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نظم کہتے وقت غالب کا شعر اختر صاحب کے ذہن میں بھی نہ رہا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے جو اختر صاحب کی نظم کا رشتہ

غالب کے شعر سے جوڑا ہے یہ میرے فہم کا قصور ہو، فیصلہ آپ پر چھوڑتا

ہوں۔ نظم ملاحظہ کیجئے:

قربت اور دوری

جذبۂ مذہب، سیاست کا خروش
علم کی جہدِ مسلسل، فن کا جوش
آدمی کی سمت ہے سب کا جھکاؤ
سب کو ہے انساں سے بنیادی لگاؤ
بات یہ ان سب کے ہے مدِ نظر
آدمی سے ہوں سدا نزدیک تر
سب کو قُربِ انسان کا منظور ہے
آدمی ہی آدمی سے دُور ہے

"اپنے سائے کے سوا" کی نظمیں پڑھتے وقت میں نے کئی بار یہ

سوچا کہ ہمارے یہاں جب رباعی کی صنف موجود ہے جس میں ہمارے

اساتذۂ فارسی و اردو نے بڑی بڑی حکیمانہ باتیں کہی ہیں تو اختر صاحب

نے بھی اپنے خیالات اسی صنف میں کیوں نہیں ادا کیے۔ میں نے

اختر صاحب سے کبھی اس موضوع پر گفتگو تو نہیں کی لیکن ان کے شعری ذوق کو جس حد تک میں سمجھ سکا ہوں اس کی روشنی میں مجھے ایسا لگتا ہے کہ اختر صاحب نظم میں نہ کوئی ایسی بات گوارا کرتے ہیں نہ ایسا مصرع جو کسی صنفی مجبوری کی وجہ سے کہا گیا ہو۔ رباعی کا وزن مقرر ہے اور فارم کی شکل یہ ہے کہ تین مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں، صرف تیسرا مصرع قافیے کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ فن کی اس سخت گیری سے بڑے سے بڑے استاد کی رباعیاں آپ پڑھیئے تو محسوس ہوگا کہ اکثر دو مصرعے بالکل بھرتی کے، صرف قافیہ پیمائی کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے جو تیسرے چوتھے مصرعے میں کہی جاتی ہے۔ جوش صاحب کی ایک بہت خوبصورت اور رومانٹک رباعی ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ناگن بن کے مجھے نہ ڈسنا بادل
باراں کی کسوٹی پہ نہ کسنا بادل
وہ پہلے پہل جدا ہوئے ہیں مجھ سے
اس دیس میں اب کی نہ برسنا بادل

ظاہر ہے کہ دوسرا مصرع بھرتی کا ہے، اور اگر فارم کی پابندی سے جوش جیسا قادرالکلام شاعر بھرتی کا مصرع لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو ان سے کچھ کم قدرت رکھنے والے کس طرح دامن بچا کے اس خارزار سے نکل سکتے ہیں۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ میں رباعی کو بے کار صنف سمجھتا ہوں۔ اس کے برعکس فارسی اور اردو کی اکثر رباعیاں علم و حکمت کے چھوٹے چھوٹے خزانے ہیں۔ اختر صاحب کو میں اس بات کی مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کا تخلیقی اور اجتہادی ذہن فارم کا پابند ہو کے حشو نویسی پر مجبور نہیں ہوا، بلکہ انھوں نے ایک ایسا مختصر نظموں کا فارم اختیار کر لیا جس میں وہ اپنی بات زیادہ خوبی سے اور زیادہ فنکارانہ انداز میں کہہ سکے۔

"اپنے سائے کے سوا" ایسا مجموعۂ کلام ہے جس کا مطالعہ انسان کو روحانی مسرت عطا کرے گا اور اس کے جمالیاتی احساس کو جلا دے گا۔

اپنے سائے کے سوا

ظلمتِ انا

ذہن پر چھائی ہے بے سود خیالوں کی گھٹا
فکر و احساس کا ہر گوشہ ہے محرومِ ضیا
چشمِ ادراک سے پوشیدہ ہے رازِ فطرت
قلبِ ویراں پہ مسلّط ہے انا کی ظلمت
نورِ عرفاں جو کبھی دِل میں نظر آتا ہے
خود پرستی کے اندھیرے میں سما جاتا ہے

خامشی

درحقیقت خامشی معراج ہے گفتار کی
اس سے بہتر کوئی بھی صورت نہیں اظہار کی
ہوگئی ہے نطق کی ہر ہر ادا جب بے اثر
میں نے دیکھا ہے طلسمِ خامشی کو کارگر
خامشی ایسے بھی لمحوں کی کہانی کہہ گئی
جن میں گویائی پشیمانی اٹھا کر رہ گئی

چاند نے سوچا

ایک چھچھلی جھیل میں اُترا ہُوا
چاند اِس سوچ میں ڈوبا ہُوا
یہ جو کچھ تھوڑا سا پانی ہے یہاں
خشک یہ بھی ہو گیا گر ناگہاں
ٹھوس دھرتی پر نہ پھر میں آؤں گا
ٹوٹ کر ورنہ فنا ہو جاؤں گا

سمندر کی پیاس

مرکوز کس لیے ہے تمھاری نظر بھلا
آشفتگانِ دل کے دریدہ لباس پر
دیکھو تو اہلِ حکمت و دانش کا اضطراب
تسخیرِ کائنات کی ناکام آس پر
صحرا کی تشنگی کے نظارے میں کیوں ہو گم؟
ڈالو ذرا نگاہ سمندر کی پیاس پر

آشوبِ دورِ آہن

رقص ہر جانب مشینی بھوت کا
حکمرانی ہر طرف فولاد کی
اجتماعی زندگی کا شور و شر
روح ہر سو مضطرب افراد کی
آرزوئیں زیرِ دامِ روزگار
خواہشوں پر غلبۂ فکرِ معاش
دورِ آہن میں سکوں کی جستجو
دوپہر میں اپنے سائے کی تلاش

گنتیوں کی فتح

مادّی دَور کے جوانوں نے
عہدِ حاضر کے پاسبانوں نے
گنتیوں کا بنا کے اک لشکر
کر لیا قبضہ ساری دنیا پر
بندے ہو گئے خرد کے نقیب
ضرب و تقسیم سے بنی تہذیب
دہر کی رہنما ہوئی تعداد
کچھ نہ باقی رہا بجز اعداد
آدمیت کا غم مٹا ڈالا
اسم کو بھی عدد بنا ڈالا

منزلِ ارتقا

شہروں شہروں ناچ رہے ہیں توہیں کے کالے بھوت
احساسات کی اجلی اجلی پریاں ہیں مبہوت
دن ہنگاموں سے بوجھل ہے تنہائی سے رات
بے معنی پھندوں میں پھنس کر بے بس ہیں جذبات
فن کا شیش محل ہے سُونا جلووں سے محروم
دنیا کے ارتقا کا یارو یہی ہے کیا مفہوم؟

جلن باہر جلن اندر

جھلستی دھوپ میں نکلا ہوں گھر سے
سلگتا جسم اپنے ساتھ لے کر
تپش باہر نظر آتی ہے جتنی
چھپی حدت ہے کچھ اتنی ہی اندر
کہاں ڈھونڈوں بھلا میں ایسی ٹھنڈک
جو میری بھی جلن کافور کر دے
اور اس کے ساتھ جو ماحول ہے بھی
یہ گرمی یہ تمازت دور کر دے

تگ و دو

عمر بھر میں دہر کے صحرا میں سرگرداں رہا
جلوہ ہائے کائنات و زیست کا خواہاں رہا
روز و شب پھرتا رہا لے کر میں قلبِ ناصبور
پا سکا اب تک نہ لیکن ایک بھی جلوے کا نور
وائے ناکامی نہ میرا غنچۂ دل کھل سکا
اپنے سائے کے سوا کچھ بھی نہ مجھ کو مل سکا

سرد و گرم

برف جیسی راتوں میں
بارہا میں جھلسا ہوں
تیز دھوپ میں اکثر
جم گیا ہوں ٹھٹھرا ہوں
وقت کی یہ بوالعجبی
راز ہے تو رہنے دو
یوں ہی مجھ کو بے سمجھے
سرد و گرم سہنے دو

اندھا کنواں

میرے احساسات کی گہرائیوں میں ہے نہاں
بے توجہ قبر کی مانند اک اندھا کنواں
اس کی تہ میں کوئی قطرہ آبِ شیریں کا نہیں
فیض اس سے روحِ تشنہ کو کبھی پہنچا نہیں
گاہے گاہے گونجتی ہے اس میں اپنی ہی صدا
جس سے خود مجھ پر ہُوا کرتا ہے طاری خوف سا
حوصلوں کو نیم جاں کرتی ہے جس کی بازگشت
دور تر ہوتا چلا جاتا ہے امکانوں کا دشت

جواز

"فرد قائم ربطِ ملت سے ہے" یہ مانا، مگر

آج ہر ملت شکستہ ہو گئی ہے کس قدر

جن سے بنتی ہے جماعت اب وہ قدریں ہیں کہاں ؟

ہر طرف شیرازہ بندی کی ہیں بکھری دھجیاں

میں اسی ماحول میں رہتا ہوں آخر کیا کروں

بھیڑ میں رہ کر بھی میں تنہا ہوں آخر کیا کروں

فرد کی صورت سے مجھ کو بھی ابھرنا ہی پڑا

"ہم" کے بدلے "میں" کا استعمال کرنا ہی پڑا

اکائی کا زوان

چہروں کے گرداب میں ہر سو
جن میں اکائی پھنسی ہوئی ہے
مشترکات کے طوفانوں میں
فرد کی کشتی گھری ہوئی ہے
تنہائی دیتی ہے سہارا
پھر بھی نہیں ہوتا کچھ حاصل
خود کو اگر پتوار بنا لو
دور نہیں نزوان کا ساحل

وقت کے قدم

جن کے پیچھے تھے کھنڈر، اُن ہوؤں نے کہا:

"وقت کی رفتار کا ہر دم ویرانی ہے کیوں ؟"

اس پہ بولی گرد: 'ہیں اس رستے کے رُخ کئی

کسی پہلو بھلا وجہ پریشانی ہے کیوں ؟

میرے بارے میں بھی سوچو۔ وقت ٹھہرے یا چلے

قدم دائم ہمیشہ میری یکسانی ہے کیوں؟"

زندگی

دہر کے گلدان میں آراستہ

زندگی ڈالی سے ٹوٹا پھول ہے

وقت کی اک مدتِ محدود پر

اس کی ساری دلکشی محمول ہے

کون جانے بعد ازاں اس کے لئے

امکاں کا باغ ہے، یا دھول ہے

آگے یا پیچھے

آگے کو مری عمر قدم اپنے بڑھائے
ہر لمحہ مگر مجھ کو یہ محسوس کرائے
پھر لوٹ رہی ہیں مری راہیں اُسی جانب
ابھرے تھے جدھر سے مرے آغاز کے سائے
موٹر میں سفر کرتے ہوئے جیسے کوئی شخص
یوں سمجھے کہ پیچھے کو سڑک بھاگتی جائے

کلیوں کا شباب

جس کلی سے صحنِ گلشن تھا سجا
اُس کا رس آوارہ بھنورا پی گیا
جو کلی تھی زینتِ بزمِ نشاط
ہو گئی وہ نذرِ اہلِ انبساط
ہے بہر صورت ہوس کا گر عذاب
کیوں بھلا کلیوں پہ آتا ہے شباب؟

تسکین کے ہیرے

رشتوں کے سمندر میں
کچھ ایسے جزیرے ہیں
ہر سمت جہاں بکھرے
تسکین کے ہیرے ہیں
لیکن وہ بھلا کیوں کر
ہیرے یہ کبھی پائے
امواجِ تعلق کی
شورش سے جو گھبرائے

اندر کا شیطان

اک ہیولیٰ مرے احساس میں پوشیدہ ہے
گاہے گاہے جو اُبھر آتا ہے شیطاں بن کر
مجھ میں آجاتی ہے خونخوار درندوں کی صفت
وار کرتا ہوں میں ہر فرد پہ حیواں بن کر
خیریت یہ ہے کہ تفہیم کی قوت کے طفیل
ایسی حالت سے میں ہوتا ہوں بہت کم دوچار
ورنہ اس قسم کے لمحے جو بکثرت آتے
یہ بھی ممکن تھا کہ ہوتا میں خود اپنا ہی شکار

بے بس مسافر

کون جانے مختصر ہے یا طویل
دھند میں لپٹی ہوئی راہِ حیات
اس پہ اک بے بس مسافر کی طرح
چلتے رہنا ہے مجھے دن ہو کہ رات
یہ بھی ممکن ہے کہ آ جائے کہیں
کوئی ایسا موڑ بھی اس راہ پر،
راستے کا خاتمہ جس پر نہ ہو
ختم ہو جائے مگر میرا سفر

مٹّی

مبارک چیز ہے، نعمت ہے مٹّی
کہ اس سے آدمی نے جسم پایا
بنائے رزق ہے، دولت ہے مٹّی
کہ اس نے دانۂ گندم اُگایا
جہاں میں باعثِ رحمت ہے مٹّی
کہ انسانوں نے اس سے گھر بنایا
مگر اک دن یہ مٹّی مثلِ اژدر
نگل جائے گی ہم کو تم کو، اخترؔ

شعلے

دل میں کم ظرف کے اُٹھتی ہیں حسد کی لپٹیں
آتشِ عشق سے عاشق کا جگر جلتا ہے
قلبِ معصوم میں ہر عابدِ پاکیزہ کے
شعلۂ خواہشِ عرفانِ خدا پلتا ہے

مَیں نہ حاسد ہوں، نہ عاشق ہوں، نہ عابدِ دوست
پھر بھی انگاروں پہ ہر وقت رہا کرتا ہوں
میری قسمت میں ہے احساسِ خودی کی حِدّت
اپنی ہی آگ میں دن رات جلا کرتا ہوں

اے بسا آرزو....

آئینہ خانے میں رہ کر یہ کہاں ممکن ہے
کوئی دیکھے نہ کسی وقت بھی صورت اپنی
کوششیں لاکھ کرے چشم گریزاں لیکن
آ ہی جاتی ہے نظر شکل و شباہت اپنی
خود شکن بننے کی خواہش تو مجھے بھی ہے مگر
آئینہ بندیٔ احساس سے گھبراتا ہوں
چاہے جس سمت بھی لے جاؤں نگاہیں اپنی
ہر طرف اپنے ہی چہرے کی جھلک پاتا ہوں

خضر کی محرومی

مثلِ اقبالؔ کے، مجھ کو بھی ملیں خضر اگر،
میں یہ پوچھوں کہ بتاؤ تو جہاں کے رہبر!
لطف دے سکتی ہے کیا دہر میں ایسی بھی حیات
جس میں ہر وقت کھٹکتا نہ رہے خوفِ ممات
فلسفہ زیست کا اقبالؔ کو سمجھا ڈالا
موت کے خوف سے کیا تم کو پڑا ہے پالا؟
زندگی کیسی ہے اے خضر تمھیں کیا معلوم
تم تو ہو موت کے اندیشے سے یکسر محروم

کلفتِ احساسِ مرگ

لطف و لذت سے عبارت عرصۂ ہستی سہی
زندگی کیف و سُرور و وجد و سرمستی سہی
لیکن اِس پر موت کی دہشت کا سایہ بھی تو ہے
اِس پہ خوفِ مرگ کی وحشت کا غلبہ بھی تو ہے
زیست کو بس ایسی اک راحت سمجھئے بے گماں
جس میں یوں ہے کلفتِ احساسِ مرگِ ناگہاں
جیسے اک چکنی سڑک پر کوئی اندھا موڑ ہو
یا کسی شفاف آئینے میں کوئی جوڑ ہو

سبزے سے تمناؤں تک

غالبؔ نے سچ کہا تھا یہ سبزے کے باب میں
بنتا نہیں جہاں میں اُسے جب کوئی مقام
بنتا ہے سطحِ آب پہ کائی وہ بدنصیب
جس کا نہ کوئی مول نہ مصرف نہ کوئی کام
لیکن یہی تو حال تمناؤں کا بھی ہے
پاتیں نہیں کہیں بھی وہ جب منزلِ سعید
اُن کی برات ہوتی ہے آہو کی شاخ پر
محرومِ منفعت سے مفادات سے بعید

حقیقتِ مبہم

اک تکلم جس پہ ہوتا ہے گمانِ خامشی
اک ترنم جس سے کرتی ہے عداوت راگنی
ایک ذرہ جس میں ہیں صحرا کی ساری وسعتیں
ایک دریا جس سے رہ جاتا ہے کوزہ بھی تہی
اک اندھیرا جس سے ہوتی ہیں فروزاں مشعلیں
اک اجالا جس سے بڑھتی ہے سیاہی اور بھی
ایک مبہم سی حقیقت ــــ ایک رازِ منکشف
سوچتا رہتا ہوں اکثر کیا ہے آخر زندگی؟

کلنڈر کا خوف

دلکشی سے ہے زندگی محروم
مقصدِ زیست بھی ہے لامعلوم
"صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے"[1]
وقت پھر کیوں ہمیں ڈراتا ہے؟
کیوں کلنڈر سے خوف آتا ہے؟

---

[1] یہ شعر مستعار ہے (اختر)

بُت شکن کا بُت

آدمی کے حوصلوں کی راہ میں
مختلف اقسام کے بُت تھے کھڑے
توڑنا ان سب کو تھا اُس کا شعار
چاہے جیسے بُت ہوں چھوٹے یا بڑے
آئی لیکن ایک ایسی بھی گھڑی
لے گئی جو حوصلے سب لُوٹ کر
بُت شکن کی زندگی کا اپنا بُت
رہ گیا دستِ قضا سے ٹوٹ کر

عذابِ ہوشمندی

ترک کر دوں شغلِ مے، رندی سے ناتا توڑ لوں
چھوڑ دوں ساغر کی اُلفت، جام و پیمانے کی چاہ
بے خودی احساس پر طاری نہ ہونے دوں، مگر
زندگی سے ہوش میں ہوگا بھلا کیوں کر نباہ؟
کیا کروں گا کان میں گونجے گا جب آہوں کا شور؟
دیکھ کر ہر سو تباہی کیسے پاؤں گا سکوں؟
دوستو میرے لیے بہتر ہے عشقِ دخترِ رز
تاکہ میں دنیا سے غافل، ہوش سے عاری رہوں

می گزرد

مجھ پہ چھایا ہے اثر یوں مری بدحالی کا
جیسے شمشان پہ سایہ ہو مہاکالی کا
جذبۂ شوق نہ آئے گا مرے دل کے قریب
تازگی ہو نہیں سکتی کبھی مرگھٹ کو نصیب
مجھ سے کترا کے ہر اک جذبہ گزر جاتا ہے
قلبِ ویراں میں قدم رکھنے سے گھبراتا ہے
ہو نہ جس شخص کے دل میں کسی جذبے کی ترنگ
اُس میں باقی نہیں رہتی کبھی جینے کی اُمنگ
میں مگر ایسے بھی عالم میں جیے جاتا ہوں
رات دن زہرِ غمِ زیست پیے جاتا ہوں

تفہیم بھی تقصیر ہے

ہر سمت سے وحشت کا سکوں سوز سماں
اٹھتی ہے ہر اک گوشے سے فریاد و فغاں
حلقوم پہ شمشیر ہے سینے پہ سناں
انساں کو نہیں ملتی ہے انساں سے اماں
کیا ہوتا ہے؟ کیوں ہوتا ہے؟ سب کچھ ہے عیاں
ہر بات سمجھتا ہوں مگر چپ ہے زباں
تفہیم پہ تقصیر کا ہوتا ہے گماں
اب فہم و فراست کو میں لے جاؤں کہاں!

مارِ آستیں

بلاؤں کی فراوانی ہے اور آفات کی کثرت
مصیبت ہی مصیبت ہے جدھر نظریں اٹھاتا ہوں
ہمیشہ اک تڑپ سی جاگزیں رہتی ہے سینے میں
نہ دن کو چین آتا ہے نہ راحت شب کو پاتا ہوں
مصائب لاکھ ہوتے یوں نہ بیتابی مجھے ملتی
حقیقت یہ ہے محسوسات نے میرا سکوں کھویا
خلش قلب و جگر کی، فطرتِ حساس نے دی ہے
مرا احساس میری آستیں کا سانپ ہے گویا

تین نسلیں

نظر آیا فضا میں اک کبوتر
دبائے چونچ میں گیہوں کی بالی
ہُوا خوش دیکھ کر اک طفل اُس کو
مسرت سے بجائی اُس نے تالی
اچانک اُس کبوتر کو بنایا
نشانہ تیر کا اک نوجواں نے
بڑے ہی کرب سے دیکھا یہ منظر
ٹھٹھک کر ایک پیرِ ناتواں نے

کیونکر؟

میں ہوں خود اپنے لئے اک مسئلہ
مجھ سے مت پوچھو غمِ دوراں کا حل
کاکلِ گیتی کے خم دیکھوں میں کیا ؟
اپنی پیشانی پہ ہیں جب لاکھ بل
دہر میں لاؤں گا کیونکر انقلاب؟
دور کر پایا نہیں دل کا جمود
بوجھ کیا دنیا کا وہ ہلکا کرے
بار ہو جس شخص پر اپنا وجود

شہر پر ہوتا ہے مقتل کا گماں
ہر طرف ہیں کشت و خوں کی لعنتیں
اس سے بہتر ہے سماں دیہات کا
نسبتاً کچھ کم ہیں جس میں وحشتیں
اس سے بھی بہتر ہے جنگل کی فضا
جس میں امن و آشتی کے سائے ہیں
کیونکہ جنگل میں نہیں وہ جانور
جس کو ہم انسان کہتے آئے ہیں

دوسرے جنم کی امید

فکروں کا الم
ادراک کا ستم
جذبوں کا ستم
احساس کا غم
ہوگا کچھ کم
شاید اُس دم
جب پائیں گے ہم
اک اور جنم

دوڑتی دنیا اور میں

دیکھتا ہوں چشمِ نیستر سے میں اپنے سامنے
برق رفتاری سے ہر ہر چیز کو جاتے ہوئے
دورِ نو کی دوڑتی دنیا کا نقشہ دیکھ کر
خوف آتا ہے مجھے پلکیں بھی جھپکاتے ہوئے
جانے کیوں ایسے میں، ہوتا ہے کبھی یہ بھی گماں
میں کسی چلتی ہوئی گاڑی میں ہوں بیٹھا ہُوا
خود مجھے تیزی سے دوڑائے لئے جاتی ہے وہ،
ورنہ موجودات کا منظر تو ہے ٹھہرا ہُوا

مَوت

زندگی کو اک جوئے کی طرح کھیلا عمر بھر
اور کوئی بازی کسی منزل پہ بھی ہارا نہیں
داؤں جتنے بھی لگائے سب میں کچھ پاتا گیا
کیا ہُوا کرتا ہے کھونا، یہ کبھی جانا نہیں
مل گیا آخر میں لیکن ایک ایسا بھی حریف
حیف جس سے ہار بیٹھا میں خود اپنا ہی وجود
چال کچھ ایسی چلی اُس نے کہ سب کچھ لُٹ گیا
ہوگیا سارا اثاثہ "نیست" سے پل بھر میں "بُود"

خیال اپنا اپنا

آئے بادل جس گھڑی
آس دہقاں کی بڑھی
مور نے دیکھی گھٹا
مست ہو کر ناچ اٹھا
دیکھ کر بدلی کا رنگ
رند کی جاگی امنگ
میں نے جب پھیری مگر
ابر کی جانب نظر
ذہن نے میرے کہا
جلد روئے گی فضا

کربِ فطرت

صبح کے عارضِ گلگوں کا وہ شیدائی ہے
شام کی چشمِ سیہ اُس کو پسند آئی ہے
دن کے بکھرے ہوئے چہرے کا وہ سودائی ہے
رات کی زلفِ فسوں ساز اُسے بھائی ہے
حُسنِ فطرت سے اُسے عشقِ حقیقی ہے مگر
کربِ فطرت سے بھی واقف ہے بخوبی اخترؔ
اُس نے دیکھی ہے اگر دلبریٔ شمس و قمر
اشکِ شبنم سے بھی بیگانہ نہیں اُس کی نظر

گناہ کا ماتم

دل پہ جو تاریک سا اک عکس ہے
نفس کے عفریت کا سایا نہیں
کر چکا ہے وار مجھ پر ایک بار
اب وہ اس نیت سے پھر آیا نہیں
پھنس کے اُس کے پنجۂ سفاک میں
مجھ سے جو سرزد ہُوا تھا اک گناہ
آج آیا ہے وہی دل کے قریب
بہرِ ماتم اوڑھ کر رختِ سیاہ

سفید پوشی

یہ راز مجھ کو بتاؤ شریف لوگوں کا
لقب ملا ہے انھیں کیوں سفید پوشوں کا
سفید ہوتا ہے بیوہ کا پیرہن یارو
سفید ہی تو ہوا کرتا ہے کفن یارو
یہ لوگ کیا صفتِ بیوگی کے حامل ہیں؟
جو مر چکے ہیں، یہ کیا اُن سے کچھ مماثل ہیں؟

من کا اندھیرا

انسان کو بھگوان نظر آئے گا کیونکر
درشن کے لیے نینوں میں شکتی ہی نہیں ہے
بھکتوں کی نگاہوں سے وہ چھپتا نہیں، لیکن
افسوس کہ سنسار میں بھگتی ہی نہیں ہے

ہونٹوں پہ ہیں نروان کی اور گیان کی باتیں
سینے کی گپھاؤں میں ہے پاپوں کا بسیرا
پوجا کے لیے سب نے جلا رکھے ہیں دیپک
مندر میں اجالا ہے مگر من میں اندھیرا

قِصّہ کِس کا لکھوں

جی میں آتا ہے کہ اک ایسی کہانی لکھوں
جس کو شیطان بھی پڑھ لے تو ہو دہشت کا شکار
سامنے میرے، مگر ہے یہ بڑی دشواری
اِس کہانی کے لیے لاؤں کہاں سے کردار
کوئی انسان بھی دنیا میں نہ ہوگا ایسا
جس کے اعمال میں شیطان سے بڑھ کر ہو فساد
کام دے گا نہ کسی شخص کا قصّہ اخترؔ
ہاں یہ ممکن ہے کہ میں اپنی ہی لکھ دوں رُوداد

پانی

پانی سے ہویدا ہوتی ہے دنیا میں خدا کی رحمت بھی
پانی میں دکھائی دیتی ہے تصویرِ عذاب و لعنت بھی
پانی کی بدولت ملتی ہے انساں کو غذا کی نعمت بھی
سیلاب کی صورت میں پانی لاتا ہے جہاں پر آفت بھی
اک جھیل کے گہرے پانی پر اِس وقت جمی ہے میری نظر
افکار ہیں ڈانواڈول مرے، جذبات ہیں میرے زیرو زبر
میں خوشی خوشی اُتروں اِس میں، اور سطح پہ تیروں ہنس ہنس کر
یا ڈوب کے اِس کی لہروں میں پا جاؤں غمِ ہستی سے مفر؟

سُست گامی

جلد منزل تک پہنچنے کے لئے
شرطِ اوّل سُرعتِ رفتار ہے
میں بھی ہوں محوِ مسافت، مجھ کو بھی
یہ صفت مطلوب ہے، درکار ہے
سُست گامی ہے مگر تقدیر میں
اس سے چھٹکارا بہت دشوار ہے
تیز قدموں سے میں چل سکتا نہیں
میرے سر پر آگہی کا بار ہے

فریبِ مکاں

تفکرات کے دن اضطراب کی راتیں
کوئی بتائے کہ ہم اہلِ غم کہاں کاٹیں
اذیتوں کی چھتیں، کلفتوں کی دیواریں
ستون درد کے، رنج والم کی محرابیں
مکاں کے نام پہ ملتے ہیں بس یہی تحفے
اماں کہاں ہے؟ کدھر ہیں پناہ کے گوشے؟
کہیں نظر سے وہ گھر بھی تو دہر میں گزرے
جو اہلِ غم کے لئے خانۂ سکوں نکلے

مجبوری

سوچنے سے فائدہ کچھ بھی نہیں

اِس حقیقت سے ہوں میں بھی باخبر

جانتا ہوں "سوچنا" ہے اک عذاب

زندگی ہوتی ہے اِس سے تلخ تر

میں مگر مجبور ہوں، لاچار ہوں

اِس سے ممکن ہی نہیں مجھ کو فراغ

لاکھ مَیں کوشش کروں لیکن کبھی

رہ نہیں سکتا ہے بے سوچے دماغ

مداوا

گھر نے بخشی ہیں مجھے وہ وحشتیں
جن کو بھائیں گے نہ ویرانے کبھی
مضطرب ہو کر میں صحرا کی طرف
جا نہیں سکتا سکوں پانے کبھی
ہاں یہ ممکن ہے کسی دن مجھ کو ہو
گھر کے آنگن ہی پہ صحرا کا گماں
اور میں اُس میں دادِ وحشت کھُل کے دوں
جس سے راحت پائے کچھ ذہنِ تپاں

معیارِ سکوں

محاذِ جنگ سے لوٹے ہوئے سپاہی سے
جو پوچھیے کہ "یہ بچّوں کا شور و غوغا کیا؟"
تو وہ کہے گا کہ "یہ شور ہے سکوں کا امیں
سوائے اِس کے سبب راحت کی اور دنیا کیا؟"
مگر، کلرک جو دفتر سے شام کو لوٹے
اِسی سوال کا شاید جواب یہ دے گا:
"سکونِ قلب کا دشمن یہ غُل غپاڑہ ہے
یہ روگ وہ ہے جو اک روز جان لے لے گا"

بے نیازی

خیال و فکرِ خوباں سے نہیں اب مجھ کو دلچسپی
کہ اُن سے ذہن و دل کے سارے ناطے توڑ آیا ہوں
جمالِ ظاہری کی منزلوں کا ذکر ہی کیا ہے
منازلِ حسنِ باطن کی بھی، پیچھے چھوڑ آیا ہوں
کسی بدصورتی سے اب نہیں نفرت نگاہوں کو
کوئی بھی عیب اب کلفت نہیں احساس کو دیتا
محاسن اور معائب دونوں بے معنی سے لگتے ہیں
اثر ان سے میں اب اچھا بُرا کچھ بھی نہیں لیتا

گیان کی چِتا

احساس کے ساحل پہ بہت دیر سے گُم صُم
مَیں گیان کی ارتھی کو لئے بیٹھا ہوں یارو
طے کر کے یہ آیا تھا کہ پھونکونگا اِسے آج
اور اب بھی یہی عزم کئے بیٹھا ہوں یارو
لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی
کس چیز پہ رکھ کر میں بھلا اِس کو جلاؤں
جھجکتی ہیں تمنّائیں کہ چھوڑیں گی دل کو
پھر اِس کے لئے دل کی چِتا کیسے بناؤں؟

مشاہدہ

دیوار میں روزن تو ہُوا کرتے ہیں لیکن
دل میں نہیں ہوتا کوئی اِس دور میں روزن
پڑتی ہے نظر سب کی، تماشوں پہ جہاں کے
رہتا ہے نگاہوں سے چھپا "سینے" کا درپن
دیتی ہے ہر اک چیز زمانے کی دکھائی
ہوتا نہیں خود اپنا ہی دیدار میسّر
باہر کے مناظر میں ہیں الجھی ہوئی نظریں
آنکھوں سے ہیں اوجھل وہ نظارے جو ہیں اندر

افعال کا حاصل

کچھ کر کے جو اُمید نہیں ہوگی صلے کی
ممکن ہے کہ ہاتھ آئے کوئی شے نہ بجز یاس
پھر کیوں نہ ہر اک کام کو اِس طرح کریں ہم
بدلے میں کسی چیز کی رکھیں نہ کبھی آس
سمجھیں تو یہی فلسفۂ سعی و عمل ہے
انسان کے افعال کا کچھ بھی نہیں حاصل
ہر فعل میں خود ہوتا ہے اک لطف سا لیکن
انعام کی لالچ تو ہُوا کرتی ہے باطل

قربت اور دُوری

جذبۂ مذہب، سیاست کا خروش،
علم کی جہدِ مسلسل، فن کا جوش،
آدمی کی سمت ہے سب کا جھکاؤ
سب کو ہے انساں سے بنیادی لگاؤ
بات یہ اِن سب کے ہے مدّ ِنظر
آدمی سے ہوں سدا نزدیک تر
سب کو قربِ انسان کا منظور ہے
آدمی ہی آدمی سے دُور ہے

اب کہاں جائیں

صنعتی شہروں میں تھی پہلے ہی پژمردہ حیات
آ گئیں قصبوں میں بھی اب زیست کی ویرانیاں
اب یہاں بھی زندگی عاری ہوئی جذبات سے
کھوکھلے چہروں کی ہیں بے جان سی پرچھائیاں
رفتہ رفتہ ہوگا دیہاتوں کا بھی عالم یہی
اُن میں بھی گونجے گی بس بے کیف سانسوں کی صدا
میرے جیسے لوگ پائیں اب کہاں ایسا مقام
چھوڑ دے پیچھے جہاں یہ عہدِ حاضر کی ادا

احساسِ برتری

جب بھی ہُوا یہ خوف مرے دل میں جا گزیں
چھوٹا نہ میرے دوست سمجھ لیں مجھے کہیں
فوراً ہی میں نے ایسی نکالی کوئی سبیل
احباب کو مِلے مری عظمت کی اک دلیل
اکثر سخنوری کو سہارا بنا لیا
شاعر کی حیثیت سے فضیلت جتا دیا
کہتے ہیں سچ ہی فطرتِ انساں کے جوہری
احساسِ برتری بھی ہے احساسِ کمتری

خواہشِ نمود

وہ سنگ جس سے میں نے تراشا ہے اک صنم
کہتا ہے "تم نے مجھ کو ادھورا کیا ہے کیوں؟
تخفیف کر کے میرے مکمل وجود میں
خود اپنے فن کے نقش کو پیدا کیا ہے کیوں؟"
کیونکر بتاؤں اُس کو کہ فنکار فطرتاً
رکھتا ہے اپنے قلب میں اک خواہشِ نمود
لازم ہے یہ کہ اس کا وسیلہ بھی ہو کوئی
لاتا ہے اِس لئے وہ تصرف میں اک وجود

حاصلِ مطالعہ

وہ جنھیں مجھ سے محبت بھی ہے ہمدردی بھی ہے

میرے علمی شوق کو کہتے ہیں بیکار و فضول

پوچھتے ہیں وہ، مجھے کیوں اُن کتابوں سے ہے عشق

ہو نہ مالی منفعت کا جن کے پڑھنے سے حصول

جانتا ہوں میں بھی، مالی فائدہ اُن سے نہیں

پھر بھی کرتا ہوں دل و جاں سے کتابوں کو پسند

سرفرازی دے نہیں سکتیں وہ دولت سے، مگر

مجھ کو کر دیتی ہیں خود اپنی نگاہوں میں بلند

مانعِ عمل

سو قسم کے خدشات سماجاتے ہیں دل میں
آتا ہے مرے سامنے جس وقت کوئی کام
آگے نہیں بڑھتا میں تفکر کی حدوں سے
افکار بچھا دیتے ہیں ہمت کے لئے دام
خطرات کا احساس عزائم کا ہے دشمن
عقدوں کو یہ لے جا نہیں سکتا کبھی حل تک
آغاز میں انجام نظر آتا ہو جس کو
وہ فکر کو پہنچائے گا کس طرح عمل تک؟

مقصدِ حیات

بے ثباتیِ زیست کی تسلیم کرتا ہوں مگر
کیا ضروری ہے کہ بے مقصد بھی ہو جائے حیات
کوئی نصب العین ہو گر آدمی کے سامنے
ہستیِ ناچیز بھی ثابت ہو روحِ کائنات
اک حقیقت مجھ پہ روشن ہے جو کرتا ہوں بیاں
جبکہ میں اے دوستو! مردِ جہاں دیدہ نہیں
بے ارادہ کیوں پھرے انسان دشتِ دہر میں
زندگی جو کچھ بھی ہو برگِ خزاں دیدہ نہیں

ہمہ گیریت

تزئین کا خیال اگر آئے ذہن میں
قیدِ مقام کا نہ تصور رہے روا

جذبات قلب میں جو محبت کے جاگ اٹھیں
انعام اُن کا سارے زمانے کو ہو عطا

اک گوشۂ جہاں کا سنورنا بھی خوب ہے
لیکن ہے خوب تر کہ سنور جائے کائنات

اپنے وطن سے پیار بڑی بات ہے مگر
سب کے وطن سے پیار ہے افضل ترین بات

دلیلِ اتحاد

لکھنؤ بستی[1] سے جب یہ آتا ہوں موڑ سے کبھی
راستے میں دیکھتا ہوں شہر پہلے رام کا
پھر بہو بیگم کا فیض آباد آتا ہے نظر
ذہن بنتا ہے نشانہ اک خیالِ خام کا
سوچتا ہوں : یہ قریبی شہر کیوں ہیں مختلف ؟
کیا عیاں کرتے ہیں یہ بھارت کا تہذیبی تضاد؟
دل مگر کہتا ہے ان شہروں کے بارے میں یہ بات
ان کی قربت ہی میں پنہاں ہے دلیلِ اتحاد

---

[1] یوپی کا ایک شہر جو میرا مولد و آبائی مسکن ہے (قمر)

گرہن اور انسان

وہ سورج روشنی کا ہے جو مخزن
ہُوا تاریک جب گرہن میں آیا
نہ جانے کیسے کیسے گرہنوں کا
اندھیرا ابنِ آدم پر بھی چھایا
مگر انسان کا نورِ بصیرت
کسی گرہن سے زائل ہو نہ پایا

ثبوتِ فضیلت

دیکھ کر غیر کے بچے کو بھی انسان کا دِل
پیار کے جذبۂ معصوم سے بھر جاتا ہے
کوئی رشتہ نہ ہو، پہچان نہ ہو، ربط نہ ہو
پھر بھی دریا سا محبت کا اُمڈ آتا ہے
تفرقے نوعِ بشر میں نظر آتے ہیں مگر
یہ وہ جذبہ ہے جو ہر دل میں مکیں ہوتا ہے
مشترک وصف یہ ایسا ہے کہ جس سے اب بھی
ابنِ آدم کی فضیلت کا یقیں ہوتا ہے

نسبتِ نور

جس سے منسوب اجالے کا تصور ہو وہ شے
بخشتی ہے مجھے ہر حال میں خوشیوں کی بہا
وہ جو بے مصرف و بیکار بھی ہو جائے تو میں
اُس کے مٹنے سے ہُوا کرتا ہوں کلفت کا شکار
مجھ کو ہوتی ہے مسرت جو دیئے کی تصویر
کھیل ہی کھیل میں کاغذ پہ بناتا ہے کوئی
ٹیس اٹھتی ہے مِرے قلب و جگر میں اختر
صبح کے وقت بھی جب شمع بجھاتا ہے کوئی

ساتھی

میرے قدموں نے چُنی تھی جو ڈگر اپنے لئے
حکمراں حدِ نظر تک اُس پہ تھیں ویرانیاں
دوسرا راہرو نہ آتا تھا نظر میرے سوا
دِل پہ تنہا حاوی اکیلے پن کا احساسِ گراں
ذہن کی سانسیں بھی تھیں یہ سوچ کر اُکھڑی ہوئی
بانٹ لے جو بارِ تنہائی کوئی ایسا نہیں،
راستے کا ایک پتھر ناگہاں یہ بول اٹھا:
"مَیں ہوں تیرے ساتھ، تو اِس راہ میں تنہا نہیں"

مَیں اور میرا فن

کس کو اِک سوکھے کنوئیں سے ہو گی سیرابی کی آس،
جس میں پانی ہی نہ ہو کیا بجھ سکے گی اُس سے پیاس
میری ہستی بھی رہی ہے آج تک محرومِ آب
مجھ سے رنگینی کے چشموں نے کیا ہے اجتناب
پھر بھی لوگوں کو توقع ہے کہ میری شاعری
اُن کے دل میں حُسن کی رہنے نہ دے گی تشنگی
اور یہ سچ بھی ہے کہ میرا فن ہے ایسا کوہسار
جس سے پھوٹے ہیں سدا رعنائیوں کے آبشار

بازگشت

صحرا کی اک چیخ میں ڈھل کر
چرخ کے گُنبد تک جاتا ہوں
روپ صدائے بازگشت کا
لے کے زمیں پر لَوٹ آتا ہوں
سُنتے ہیں پھر لوگ مجھے یوں
سر کو جُھکا کر خاموشی سے
جیسے سُنیں الہامی کلمے
اہلِ عقیدت رِشی مُنی سے

علم کی نگری

سو گیا کل پڑھتے پڑھتے اک کتاب
ناگہاں دیکھا انوکھا سا یہ خواب
ایک قبرستان میں ہوں میں کھڑا
جس میں وحشت ہے نہ ویرانی ذرا
ہر طرف قبریں ہی قبریں ہیں مگر
زندگی کا بھید ہے جوشش پر
میں نے سوچا: یہ جگہ ہے کون سی ؟
کوئی بولا: "ہے یہ نگری علم کی"

آئینہ ٹوٹ کے بھی...

آئینہ کیسے ہی عالم میں رہے
کوئی کیونکر اُسے بے سود کہے؟
خستہ حالی میں بھی کرتا ہے سدا
فرض اپنا وہ بہر طور ادا
ٹکڑے ٹکڑے بھی وہ ہو جائے اگر،
عکس کرچوں میں بھی آتا ہے نظر

میرے انجام کا مصرف

شمع تک دیکھا تھا پروانے کو جاتے تیر سے
پھر نظر آیا تھا اُن کو شعلۂ پُرپیچ و تاب
لے گئی جب مجھ کو وحشت سوئے شمعِ آرزو
کس نے دیکھا کس نے جانا میری سوزش کا عذاب؟
میر جیسا دیکھنے والا جو جلتا مجھ کو بھی
میرے جلنے کا ساماں بھی کچھ تو ہوتا کام کا
اس سے بھی اک شعر کی تخلیق ہو جاتی اگر
یہ حسیں مصرف بھی کیا کم تھا مرے انجام کا

بائیں پسلی کا درد

جس کو جنت سے ملا تھا ایک دن "حکمِ سفر"
کر کے اب تک ختم وہ کارِ جہانِ بحر و بر
لوٹ کر جاتا خدا کے پاس اور کرتا کلام:
پھر کوئی دنیا بنا، اور دے مجھے پھر کوئی کام،
لیکن اُس کی بائیں پسلی کا مٹا اب تک نہ درد
جس سے اُس کا جذبۂ سعی و عمل ہوتا ہے سرد

جذبۂ محبت

جب دل میں محبت نے طوفان اٹھایا ہے
ایوانِ خردمندی پل بھر میں گرایا ہے
نظروں سے حقائق کے جلووں کو چھپایا ہے
خوابوں کا صنم خانہ آنکھوں میں بسایا ہے
تشکیک کے شعلوں سے سینے کو جلایا ہے
ہر اپنے پرائے پر الزام لگایا ہے
وحشت کو تلوّن کا آئینہ دکھایا ہے
اک ننھے سے جذبے نے کیا کیا نہ کرایا ہے

ضربِ گُل

کوئی برسائے پتھر
تو شکوہ بے ضرورت
کوئی اک پھول پھینکے
تو لازم ہے شکایت
کرے پتھراؤ دشمن
تو بے شک کچھ نہ بولوں
جو ساتھی گُل سے مارے
تو کیونکر لب نہ کھولوں؟

سوچتا ہوں کہ..

لاکھ شاداب ہو، آباد ہو دنیا کا چمن
دل کی قسمت میں ہے تنہائی کے کانٹے کی چبھن
بے سہارا یہ ہمیشہ سے رہا ہے یارو
اِس نے ہر درد اکیلے ہی سہا ہے یارو
صرف اک راز جو سینے میں چھپا بیٹھا ہے
دوست بن کر اِسے تسکین دیا کرتا ہے
سوچتا ہوں کہ میں وہ راز بھی افشا کردوں
دل کو اب دہر میں بالکل ہی اکیلا کردوں

میری دہلیز کا دیا

میری دہلیز پہ جلتا ہُوا ننھا سا دیا
منتظر ہے کہ کوئی اُس کی طرف بھی آئے
چاہے وہ اُس کے لئے ظلم کا پیکر بن کر
غیظ و نفرت سے اُسے آ کے بُجھا ہی جائے
یا لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اُٹھا کر اُس کو
سایۂ دامنِ خوش رنگ کی دولت بخشے
اُس کی سہمی ہوئی ہستی کو بہ اندازِ کرم
اک ذرا دیر کو احساسِ حفاظت بخشے

سنگم

کل سڑک پر سامنے سے میرے، گزری اک برات

دیکھ کر اس کو یکایک ذہن میں اُبھری یہ بات

آج اِس دولھا کے دل کی آرزو بر آئے گی

اک حسینہ بھی تمناؤں کی منزل پائے گی

دو دِلوں کی خواہشوں کا میل ہو گا اِس طرح

ملتی ہیں سنگم پہ گنگا اور جمنا جس طرح

ڈر ہے لیکن سرسوتی[1] کی طرح اِس سنگم پہ بھی

گُم نہ ہو جائے کسی بے بس کے خوابوں کی ندی

---

[1] پریاگ (الٰہ آباد) میں گنگا، جمنا اور سرسوتی تین دریاؤں کا سنگم ہے لیکن سرسوتی کا دھارا نظروں سے اوجھل رہتا ہے (اختر)

انتظار

دس برس پہلے میں جب آیا تھا اپنے گاؤں میں
جوگیوں کی ایک ٹولی تھی یہاں ٹھہری ہوئی
اُن میں اک جوگی تھا جس کے ساتھ پنگھٹ پر مجھے
ایک دوشیزہ ملی تھی شام کو بیٹھی ہوئی

آج پھر جب گاؤں میں آیا ہوں میں دس سال بعد
میں نے دیکھا ہے کہ اک بے برگ ٹہنی کے تلے
جھرّیاں رخ پر لیے گم صم وہ رنگ سے کھڑی
اِس سے بے پروا کہ دن ڈوبا دیئے ہر سو جلے

دُلھن اور دِل

اے مری سکھیو تم آؤ
آکے گھر میرا سجاؤ
ہاتھ میں مہندی رچاؤ
مانگ میں افشاں لگاؤ
تال ڈھولک کی ملاؤ
گیت شادی کے سناؤ
مجھ کو ڈولی میں بٹھاؤ
دل کو سُولی پر چڑھاؤ

عروسی جنازہ

کل شب کو تیرے کوچے میں شادی کا جشن تھا
دیکھا اُسے جو میں نے تو دل نے کہا سنبھل
ویسے تو گوشے گوشے میں خوشیوں کی تھی بہار
لیکن اُداس اُداس تھا پھر بھی ترا محل
اِس طرح غم بکھیر رہی تھی صدائے نَے
سازِ طرب پہ جیسے کہ فانی کی ہو غزل
سنتا ہوں تیرے ہاتھ پہ یوں تھا حنا کا رنگ
رکھا ہوا ہو جیسے چِتا پر کوئی کنول

نعم البدل

یہ سچ ہے میں جو تری سمت ابتدا میں جھکا
تو اس کی وجہ یہی تھی کہ تیری صورت میں
جھلک ملی تھی مجھے اُس حسین چہرے کی
بسا ہوا تھا جو مدت سے دل کی خلوت میں
مگر یہ بات بھی سچ ہے کہ اب فقط تو ہی
مرے دماغ پہ حاوی ہے، دل میں ہے آباد
وہ حسن جس کے سبب سے تجھے سراہا تھا
اگر خیال میں ہے بھی تو بن کے صرف اک یاد

بھولی کہانی

مرے شہر کی اک شکستہ حویلی
جو بھوتوں کا اب بن گئی ہے نشیمن
مجھے ایک بھولی کہانی سنا کر
مرے دِل کی اکثر بڑھاتی ہے دھڑکن
کسی شوخ آنچل کی بے تابیوں سے
کبھی اس میں الجھا تھا میرا بھی دامن
مگر اس کے آنگن میں اک دن بنا تھا
محبت کے معصوم جذبے کا مدفن

یادوں کا زہر

بیتے ہوئے دنوں کی ہیں یادیں بھی اک عذاب
رہتا ہے ذہن و قلب پہ اِن کا سدا عتاب
ادراک و فہم کو بھی یہ ڈستی ہیں دم بدم
جذبات کے لیے بھی نہیں ناگنوں سے کم
چاہا تھا شاعری تو نہ مسموم ہو، مگر
یادوں کا زہر اس پہ بھی کر ہی گیا اثر

کچی سڑک

زندگی ہے یا کوئی دیہات کی کچی سڑک
اونچی نیچی، ٹیڑھی میڑھی، بدنما آخر تلک
رونقیں مفقود، ویرانی کے سائے ہر قدم
نصب ہر ہر موڑ پر دہشت کے نادیدہ علم
ایک ہی صورت ہمیشہ، ایک ہی عالم مدام
ایک ہی ڈھرے پہ قائم صبح سے تا وقتِ شام
گاہے گاہے بس کسی بارات کا کچھ جمگھٹا
یا کسی ارتھی کے پیچھے گریہ و آہ و بکا

چہروں کی بے چہرگی

جدھر نظریں اٹھاتا ہوں اُدھر چہرے ہی چہرے ہیں
مگر ان سب میں اک بے چہرگی سی دیکھتا ہوں میں

کوئی صورت بناکرتی ہے جس سے شکلِ انسانی
ہر اک چہرے کو اُس خوبی سے عاری دیکھتا ہوں میں

لقب چہرے کا زیبا ہے اُنھیں کے واسطے یارو
جو احساسات اور جذبات کی تفسیر ہوتے ہیں

نہ مانو فیصلہ میرا، خود اپنے ذہن سے پوچھو
کہیں ادراکِ سادہ بھی کبھی تصویر ہوتے ہیں

تضاد

شاہراہوں پر اجالے ہی سہی
تنگ گلیوں میں تو ہیں تاریکیاں
ہمہمہ کیسا ہی بازاروں میں ہو
ہیں گھروں میں خیمہ زن خاموشیاں
محفلوں پر ہے بہر صورت شباب
خلوتوں کی ہر ادا بے جان ہے
اجتماعی رونقیں ہیں اوج پر
انفرادی زندگی ویران ہے

بھرم قائم رہے

دراڑیں پڑ رہی ہیں دل کے اندر
مگر چہرے کو ہم چمکا رہے ہیں
تباہی آ رہی ہے ہم پہ جو کچھ
اُسے پردے میں کرتے جا رہے ہیں
ہوئے کوشاں نہ اِس کے واسطے ہم
کہ بربادی کا سایہ ہم سے بھاگے
ہماری کوششوں کا ہے یہ مقصد
بھرم قائم رہے اوروں کے آگے

دوریاں

تفرقے مذاہب کے، ملک و قوم کے جھگڑے
کشمکش مقاصد کی، بغض و کینہ و رنجش
گاہ وجہ آویزش مسئلہ جماعت کا
اختلاف کا باعث گاہ فرد کی خواہش
یوں تو ساتھ رہتے ہیں لوگ دہر میں ہر جا
اور بزعم خود ان کے دل بہت کشادہ ہیں
سچ مگر یہ ہے اختر: وارثانِ آدم میں
قربتیں بہت کم ہیں، دوریاں زیادہ ہیں

محفوظ اثاثہ

آفات کا طوفان مڑا جب مری جانب
تاراج کیا گھر کو مرے چشم زدن میں
ایسی مرے مسکن کی ہوئی شکل دشباہت
جیسے کوئی پامال شدہ لاش ہورن میں
سب ہو گئے اجزائے مکاں خاک میں شامل
بیٹھا ہوں لئے دل میں غم سقف و در و طاق
ہمراہ مکاں لے گئی ہر چیز بھی گھر کی
محفوظ ہیں لیکن مرے دیوان کے اوراق

شاعر اور شنکر

ادراک ہے پرلوک کی گنگا کے مماثل

جس طرح کا دھارا کہ جو روکے سے نہ رک پائے

شاعر کا تصور کسی شنکر کی جٹا ہے

یہ سیلِ بلا خیز بھی جس میں کہ سما جائے

پہلے وہ سمیٹے اسے افکار میں اپنے

پھر اس میں سے اک بوند کو سنسار میں پھیلائے

صلیب بر دوش

بُھلائیں کیسے بھلا قصۂ صلیبِ مسیح
کہ اس سے جلتی ہے روحِ وجود ہماری بھی
سنائی حق کی صدا اہلِ دہر کو، لیکن
صِلے میں پائی ہزیمت بھی، دل فگاری بھی
سزائے موت ملی ہم کو اُن کے ایما پر
جنھیں سمجھتے رہے اپنا غمگسار و حبیب
بڑھا رہے ہیں قدم اپنی قتل گاہ کی سمت
اٹھائے دوش پہ ہم بیسویں صدی کی صلیب

مفہوم نہیں کچھ

شہر شہر نگری نگری میں
کوچے کوچے گلی گلی میں
باہر باہر خاموشی سی
اندر اندر سرگوشی سی
دہن دہن گفتار کی خواہش
زباں زباں اظہار کی کوشش
بات ہے کیا معلوم نہیں کچھ
لفظ تو ہیں مفہوم نہیں کچھ

حصار

پھنس گیا ہے "مَیں" کے گھیرے میں دماغ
مِل نہیں پاتا تصور کو فراغ
ہوگیا ہے اس کی قدغن سے یہ حال
جا نہیں سکتا کسی جانب خیال
اس کے باعثِ فہم ہے مجبور سی
قوتِ افکار ہے محصور سی
ٹوٹ جائے کاش اِس "مَیں" کا حصار
ذہن کو میرے ملے راہِ فرار

قطرے کا سہارا

روح کا پیاسا پرندہ ریگزارِ عقل میں
ہر طرف اڑتا پھرا لیکن نہ دیکھی شکلِ آب
دُور سے آئی نظر بھی گر چمکتی شے کوئی
پاس جا کر تشنہ طائر نے فقط پایا سراب
انتہائے یاس میں آخر دکھائی دی وہاں
معجزے کی طرح اک شبنم کے قطرے کی جھلک
اُس نے سوچا میں اگر پی جاؤں یہ قطرہ تو پھر
اِس بیاباں میں کہیں ہو گی نہ پانی کی چمک

تشہیرِ نام

تختی مرے مکان پہ اک ہے لگی ہوئی
جس پر جلی حروف میں لکھا ہے میرا نام
مَیں ہی نہیں ہوں دہر میں اِس دام کا اسیر
تشہیرِ نام کی یہ روش ہے جہاں میں عام
اکثر مَیں سوچتا ہوں کہ یہ سلسلہ ہے خوب
اِس میں قضا کے ہاتھ بھی ہوتے نہیں مُخل
مرنے کے بعد نام کی تختی سے یہ حروف
ہونگے مرے مزار کے کتبے پہ منتقل

اسیری

صدیاں مرے پیچھے تھیں، صدیاں مرے آگے ہیں
میں وقت کے نرغے سے نکلوں تو بھلا کیونکر؟
زنجیر کے حلقے ہیں یہ شام و سحر گویا
ملتا نہیں چھٹکارا اِن سے کسی قیمت پر
ایّام کا اک زنداں، مَیں نے تو اُسے جانا
جو سب کی نگاہوں میں مستقبل و ماضی ہے
پاؤں گا نہ آزادی ہرگز کبھی دنیا میں
شاید مری ہستی کا مقصد ہی اسیری ہے

مرا نقشِ جمیل

تلخئ کام و دہن دنیا سے جو مجھ کو ملی
جھلکیاں اُس کی نہ آئیں کچھ مری تحریر میں
ظلمتِ بغض و حسد چھائی رہی ہر سُو مگر
خود کو چمکایا ہے مَیں نے پیار کی تنویر میں
نکھرے یوں نفرت میں بھی الفت کا ہو نقشِ جمیل
جیسے گوتم بدھ کی مُورت سایۂ شمشیر میں

دھوئیں کا حُسن

مِرے سر پر دھواں پھیلا ہُوا ہے
(مِلوں کے شہر کا باسی جو ٹھہرا)
مگر مجھ کو نہیں وحشت ذرا بھی
(اِسی ماحول کا عادی جو ٹھہرا)
دھوئیں میں ہو کے شامل چاندنی نے
عطا کر دی ہے اِس کو دلبری سی
کچھ ایسی شکل اِس میں بن رہی ہے
کہ جیسے اُڑ رہی ہو اک پری سی

زہر مِرا اور امرِت سب کا

خاموشی سے گیان کا ساگر متھا ہے برسوں،

کام یہی اک بڑا جہاں میں کیا ہے مَیں نے

سچائی کا امرت مجھ کو ہُوا تھا حاصل

فیاضی سے جس کو بانٹ دیا ہے مَیں نے

لیکن اس سے قبل ملا تھا زہر بھی یارو

شنکر بن کر جسے اکیلے پیا ہے مَیں نے

ڈاکٹر اختر بستوی کی دیگر مطبوعہ کتب

نغمۂ شب (طویل نظم)	**بحرِ بیکراں** (طویل نظم)
پیکرِ خیال (مجموعۂ قطعات)	**شہر سے دور** (شیکسپیر کے ایک ڈرامے کا ترجمہ)
سخنِ جوہر (مولانا محمد علی جوہر کے کلام کی تاریخی ترتیب مع حواشی و مقدمہ)	**کردار کے غازی قاضی محمد عدیل عباسی** (قاضی محمد عدیل عباسی کے متعلق مختلف قلمکاروں کے مضامین کی ترتیب، جامع توقیت اور مقدمے کے ساتھ)

ڈاکٹر اختر بستوی